۱۸۸۱ء سے ۱۹۹۹ء تک

تبصرہ از محترمہ زاہدہ حنا

محترمہ سلطانہ ذاکر آدا ہماری ان خواتین میں سے ہیں جنہیں قلم اور ادب سے عشق ہے۔ پاکستان میں تھیں تو شعر اور نثر، دونوں میں طبع آزمائی کرتی تھیں۔ اب امریکہ میں ہیں تو بھی نہ کاغذ ہاتھ سے چھوٹا اور نہ قلم سے رشتہ ٹوٹا۔ پاکستان کا پھیرا لگاتی ہیں اور تحفہ میں کسی کتاب کا مسوّدہ لے آتی ہیں۔ اس مرتبہ انہوں نے "سفر کب تک" کا ڈول ڈالا ہے۔ کہنے کو تو یہ سفر کی یادداشتیں ہیں، لیکن سچ پوچھیئے تو یہ سفرِ زندگی کا قصّہ ہے جو ریاست رامپور سے شروع ہوا اور چشمِ بدُور، اب تک آن بان سے جاری ہے۔

رامپور کے نام سے بہت سی خوش گوار یادیں وابستہ ہیں، حالانکہ میں نے وہاں کبھی قدم نہیں رکھا۔ ۱۹۷۶ء میں جب ہمارے عرشی چچا (رامپور رضا لائبریری سے متعلق) کو معلوم ہوا کہ میں رامپور کے قریب سے گزری ہوں لیکن ان کی قدم بوسی کے لئے نہیں آئی تو انہوں نے اپنی ناراضگی کا اظہار ایک پوسٹ کارڈ کے ذریعے کیا۔ میرے والد نے بارہ برس ریاست رامپور میں بسر کئے۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی ایسے جید عالم، عندلیب شادانی ایسے شاعر، شرافت علی خاں، ولی اللہ خاں اور عبدالواحد خاں (رضا لائبریری) ایسے ادب نواز اور علم دوست حضرات سے آخری سانس تک ان کا دوستانہ رہا۔ برادرم ذاکر علی خاں جو ایک نامدار اہلِ قلم ہیں اور سرسّید انجینئرنگ یونیورسٹی کراچی کے بانیوں میں سے ہیں، وہ میرے والد کی گودوں کے کھلائے ہوئے

ہیں، اور خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، کی نئی زندگی میں کردار ادا کرنے والے ڈاکٹر عابد رضا بیدار میرے بہنوئی ہیں۔

"سفر کب تک؟" پڑھنا شروع کیا تو رامپور کے ذکر نے ہر صفحے پر آنکھیں ٹھنڈی کیں۔ اور رامپور ہی کیا، سلطانہ صاحبہ زندگی کے جن ادوار میں جن مراحل سے گزریں، انہوں نے سبھی کا سادگی اور صفائی سے ذکر کیا ہے۔ اسی طرح شہروں اور لوگوں کے بیان میں بھی ایک سلامت اور نفاست ہے۔

سلطانہ صاحبہ عورتوں کی اس نسل سے تعلق رکھتی ہیں جو زنان خانے سے باہر قدم نکالنے کا تصوّر نہیں رکھتی تھی۔ اگر کبھی کہیں جانا ہوا تو ڈولیوں اور پالکیوں میں چار کہاروں کے کاندھے پر سفر کرتی تھی۔ لیکن زمانہ اس تیزی سے بدلا کہ زنان خانے میں زندگی گزر کرنے والی سلطانہ صاحبہ اب برِّ اعظم ایشیا سے امریکہ کا سفر کرتی ہیں اور واقعات لکھتی ہیں۔ ۱۹۳۴ء/۱۹۳۵ء میں اپنے پہلے سفر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں .....

> "ہم شادی میں رتھ پر اپنی والدہ کے ساتھ گئے ..... ناگوری بیلوں کی پیٹھ پر سُرخ کپڑے پڑے ہوئے اور اُن کپڑوں پر کوڑیوں کا کام بنا ہوا۔ بیلوں کے گلے میں گھنگروؤں کے ہار پڑے ہوئے، آنکھوں پر سفید جھالر لٹکی ہوئی، جھوم جھوم کے چلتے ہوئے بیل اور ہلِ ہلِ کر سفر کرتے ہوئے ہم لوگ اور رتھ کے اوپر منڈھے ہوئے سُرخ اور ہرے رنگ کے کپڑے، بُرج نما گول سے اٹھے ہوئے۔ گرمی بھی غضب کی ہو رہی تھی۔ اس پر طُرہ یہ کہ چار سال کی لڑکی بھی پردے کی پابند۔ ذرا سی جھری کر کے باہر جھانک نہیں سکتے کہ مرد حضرات ساتھ ساتھ دوسرے رتھوں پر چلے جا رہے ہیں، کسی کی نظر نہ پڑ جائے، ہمارے ابّا نہ دیکھ لیں....."

کہاں چار برس کی وہ سلطانہ کہ رتھ پر سوار ہو کر شادی میں گئی تھیں اور اسے چادروں کی جھری سے جھانکنے کی بھی اجازت نہ تھی اور کہاں سلطانہ صاحبہ کہ لندن، فرینکفرٹ، دمشق، اور جدّہ کو جاتی ہیں، سانتا باربرا اور سان فرانسسکو کی سیر کرتی ہیں اور لاس ویگاس جا کر دنیا کے سب سے بڑے جوئے خانے کو بھی برائے حیرت وعبرت دیکھ کر آتی ہیں۔

زمانہ واقعی منقلب ہو چکا، زنان خانوں میں رہنے والیاں زقندیں لگا کر کہاں کہاں نہ پہنچیں اور ان میں سے جنھوں نے قلم ہاتھ میں لیا، انھوں نے اپنے نت نئے تجربات خوب خوب لکھے۔ اس مرحلے پر ان خواتین کو ضرور یاد کرنا چاہئے جنھوں نے اُنیسویں صدی میں تعلیم حاصل کی اور تصنیف و تالیف کا آغاز کیا۔ یوں تو ہمارے یہاں شہزادی گلبدن بیگم، شہزادی زیب النسا مخفی، مہ لقا، چندا بائی اور دوسری متعدد شاعرات کا ذکر ملتا ہے، لیکن نثر کا معاملہ ذرا دوسرا ہے۔ یہ اوّلیت صوبہ بہار کے حصے میں آئی کہ شمس العلماء نواب امداد امام اثر کی خواہر گرامی محترمہ رشید النسا نے ۱۸۸۱ء میں ناول "اصلاحِ النسا" تصنیف کیا جو ۱۸۹۴ء میں پٹنہ سے شائع ہوا۔ اب تک کی تحقیق کے مطابق یہ کسی خاتون کا لکھا ہوا پہلا اردو ناول تھا۔

۱۸۸۱ء سے ۱۹۹۹ء تک برِصغیر کی پڑھی لکھی خواتین نے ایک بہت طویل سفر کیا ہے اور اس سفر کے دوران بڑے بڑے نام آتے ہیں۔ ان لکھنے والیوں سے اردو ادب کی تاریخ سجی ہوئی ہے، اور اسی میں سے ایک نام سلطانہ ذاکر آدا کا ہے جنھوں نے اپنی زندگی کے رنگ اور اپنے اور اپنے ان گنت اسفار کے ڈھنگ بہت خوشدلی اور خوبصورتی سے لکھے ہیں۔ بطورِ خاص رامپور میں اپنے بچپن کی یادیں لکھ کر انہوں نے ایک ایسے عہد کو محفوظ کر دیا ہے جس کا تذکرہ کرنے والے اب خال خال نظر آتے ہیں۔

۔ زاہدہ حنا